قاضی عبدالودودؒ

"...... مذاہب میرے نزدیک انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت سے لوگوں کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بکثرت اصحاب جو شریعت کے احکامِ ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں... ـــــ"

Scanned by CamScanner

یہ مضمون معاصر کی فرمائش پر لکھا جا رہا ہے[1] اور کوشش کی گئی ہے کہ کل سوالات کے جو کئے گئے ہیں، جواب دیئے جائیں۔ اگر کوئی بات کہیں اور مختلف طور پر ہے تو اس سے قطع نظر کر صریحاً اس کی تردید ہوئی ہے یا نہیں، اس جگہ جو لکھا جا رہا ہے صحیح سمجھا جائے۔

قاضی عبدالودود، بن قاضی عبدالوحید بن قاضی عبدالحمید بن قاضی اکرم الحق بن قاضی امین الحق، بن قاضی کمال الحق، بن قاضی غلام یحییٰ، بن غلام شرف الدین از اخلاف ملا عبدالشکور تاج فقیہی۔

قاضی عبدالوحید متولد ۱۲۸۵ھ عربی کی تکمیل اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ ایف اے کے بعد میرے دادا انہیں قاضی رضا حسین[2] کے مشورے پر انگلستان تعلیم کے لئے بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہی نہیں۔ انہوں نے یہاں رہ کر بھی مزید انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ان کے خیالات میں انقلاب آگیا تھا اور وہ مغربی تعلیم کو مذہب کے لئے سم قاتل سمجھنے لگے تھے۔ "نیچریوں" (پیروان سرسید احمد خاں) کے متعلق جو ان کی رائے ہوگی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ندوۃ العلما تک کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ۳ ے یا اس سے بھی زیادہ فرقے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، ان میں صرف ایک ناجی ہے۔ پٹنہ میں ندوۃ العلما کا ایک سالانہ اجلاس ہوا تو انہوں نے بھی بڑے پیمانے پر ایک جلسہ کیا جس میں بریلوی صاحب اور دوسرے علما جو ان کے ہم خیال تھے، شریک ہوئے تھے۔ کلکتے میں ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس ہونے لگا تو وہ کلکتہ والوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کرنے کے لئے کلکتہ گئے۔ وہاں وہ ابوالکلام آزاد کے والد سے بھی ملے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ابوالکلام آزاد سے متعلق جو کتاب لکھی ہے اور جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ خود ابوالکلام آزاد کی لکھوائی ہوئی ہے مرقوم ہے کہ قاضی عبدالوحید اپنے کو عقائد میں بہت متشدد سمجھتے تھے۔ مگر ابوالکلام آزاد کے والد سے ملے تو انہوں نے انہیں اپنے سے زیادہ متشدد پایا۔ قاضی عبدالوحید خود بہت متشرع تھے لیکن اس معاملے میں سخت گیر نہ تھے۔ برادری میں ایسے لوگ تھے جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن ان سے قطع تعلق نہیں ہوا۔ ان برادری والوں سے جو غیر مقلد تھے، برادری ترک کر دی تھی۔

---

[1] معاصر۔ پٹنہ (قاضی عبدالودود نمبر ص ۱)۔
یہ آپ بیتی دائرہ ادب پٹنہ کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

[2] قاضی رضا حسین کے والد کی دوسری شادی اسد علی (جد مادری قاضی عبدالحمید) کی بیٹی سے ہوئی تھی مگر یہ لاولد رہیں۔ قاضی رضا حسین کے تعلقات سرسید احمد خاں سے تھے اور انھوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ مسلمانان بہار مغربی تعلیم حاصل کریں

[3] ان کی ایک تصنیف مجھے اپنے والد کی کتابوں میں ملی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ "شیطان سے ابوجہل بدتر اور ابوجہل سے وہابی بدتر ہیں۔"

انہوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لیۓ ایک ماہنامہ "تحفۂ حنفیہ" نکالا تھا جو ان کی وفات کے بعد بھی برس دو برس تک جاری رہا۔ انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس پر ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ یہ ان کی موت کے کچھ ہی دن بعد بند ہو گیا۔

قاضی عبدالوحید نے اپنے ابتدائی زمانے میں شعر بھی کہے۔ انہوں نے وحید الہٰ آبادی کی صحبت پائی تھی اور ان کا تخلص وحید تھا۔ میں نے لڑکپن میں ان کی طرحی غزلیں غازی پور کے ایک گلدستے میں دیکھی تھیں مگر اب اس کا کوئی شمارہ میرے پاس نہیں۔ شاہ مقبول احمد صاحب (کلکتہ) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کراچی سے جو کتاب بنام "مسلم شعرائے بہار" شائع ہوئی ہے۔ اس میں ان کا حال اور کلام ہے۔ ڈاکٹر حامد علیخاں (علیگڑھ) نے مجھ سے ان کے حالات مانگے تھے اور لکھا تھا کہ ان کے عربی اشعار میری نظر سے گذرے ہیں۔ ہندوستان کے عربی گو شعرا سے متعلق ان کا مقالہ مکمل ہو گیا ہے مگر مجھے علم نہیں کہ ان کا ذکر اور کلام اس میں ہے یا نہیں۔ ان کے عربی اشعار میں نے نہیں دیکھے۔

یہ کہا جا چکا ہے کہ وہ بہت متشرع تھے۔ میرے دادا نے کئی آدمیوں کو سودی قرض دے رکھا تھا۔ ان کی موت کے بعد انہوں نے سود کے ہزاروں روپے معاف کر دیئے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے بہت روپے دوسروں پر صرف ہوا کرتے تھے۔ وہ بہت راست گفتار تھے اور معاملات کے کھرے۔ کوئی شخص اگر ان کے ساتھ بد معاملگی کرتا تو وہ اس سے خواہ وہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، بہت خفا ہوتے تھے اور اس کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ خدا پر انہیں بہت بھروسہ تھا۔ میرے حقیقی ماموں طاعون میں مبتلا ہو گئے مجھے ان کے پاس جانے سے بالکل نہ روکا۔ وہ تو ماموں تھے، میرے معلم کا ایک بھائی اسی مرض کا شکار ہو گیا۔ اس کے پاس جانے کی بھی ممانعت نہ تھی۔ دونوں اسی مرض میں مر گئے۔

قاضی عبدالوحید کی شادی سید شاہ لطف الرحمٰن متوطن کاکو (قریب جہان آباد) کی بیٹی سے ہوئی جو میرے نانا، میرے دادا کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ قاضی عبدالوحید کی وفات ربیع الاول ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ ان کے مرض الموت میں بریلوی صاحب ہمارے یہاں آئے تھے اور ان کے چہارم کے بعد بریلی واپس چلے گئے تھے۔ باقر عظیم آبادی (یہ وہی باقر ہیں جن کا ذکر داغ کی فریاد داغ میں ہے) نے ایک طویل نظم ان کی وفات پر لکھی تھی اور لفظ "مغفور" سے سال وفات نکالا تھا۔ یہ نظم تحفۂ حنفیہ میں شائع ہوئی تھی۔

قاضی عبدالحمید بخشی محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے خالو شیخ احمد اللہ کا انتقال ہوا تو ان کی ساری جائیداد ان کی زوجہ کے قبضے میں آئی۔ انہوں نے اس کے انتظام کے لئے اپنے بھانجے کو نوری کٹرا بلا لیا۔ اور وہ اسی محلے میں رہنے لگے۔ وہ ایک دنیادار آدمی تھے اور ان کے مشاغل علمی نہ تھے مگر شاعری سے انہیں کچھ لگاؤ ضرور تھا۔ ایک شخص بندہ علی نشتر ان کے یہاں نوکر تھے اور میں نے سنا ہے کہ ان کے استاد انوار عالم متخلص بہ شاہ شاگرد دبیر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال ان کے ساتھ گزارے تھے۔ ایک خط جو شاہ نے قاضی عبدالحمید کے نام لکھا تھا۔ وہ اس زمانے میں شاید نثر کا اچھا نمونہ سمجھ کر چھپوا دیا گیا تھا۔ میں نے یہ نہیں سنا کہ خود قاضی عبدالحمید نے شعر کہا ہو۔ ان کی شادی سید امجد علی ساکن جربھوا (قریب حاجی پور) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

قاضی محمد اسمٰعیل کا نام دہلی کے مشہور عالم کے نام پر سید احمد بریلوی کے کہنے سے رکھا گیا تھا۔ وہ ان کی ولادت کے زمانے میں پٹنہ آئے تھے۔ یہ صوفی مشرب تھے اور بریلوی صاحب کو ان کے عقائد کی اطلاع ہوتی تو بلا شبہ انہیں بدعتی قرار دیتے۔ ان کا تخلص قدیم تھا اور ان کی نظم و نثر میرے پاس موجود ہے۔ انھوں نے ایک افسانے میں رموز تصوف بیان کئے ہیں۔

قاضی اکرام الحق سید احمد بریلوی کے مرید یا معتقد تھے ۔ ان کی وفات ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت ان کے برادرِ خرد، واعظ الحق زندہ تھے ۔ اور وہ ان ۳ علماء میں تھے جو نظر بند کئے گئے تھے ۔ اس کا ذکر اس ہنگامے کی تاریخ میں ہے ۔

قاضی امین الحق کی شادی قاضی امام بخش بن قاضی حسن رضا بن عابد خاں ملقب بہ نقابت خاں (برسہ قاضی شہر پٹنہ کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔

قاضی کمال الحق کی شادی قاضی سید عوض (از سادات بارہہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔ یہ فارسی گو تھے ۔ اور ان کا تخلص کمالی تھا۔ ان کا کلیات ان کی زندگی ہی میں ضائع ہو گیا تھا ۔ مختصر دیوان میرے پاس موجود ہے ۔

قاضی غلام یحییٰ محشی شرح آداب المریدین تھے ۔ ان کی اور کتابیں بھی ہیں ۔ ان کے زمانے میں ایک اور غلام یحییٰ تھے جو قاضی القضاۃ تھے ۔ مقدم الذکر ان سے مختلف ہیں ۔ تاج فقیہہ کا نسب نامہ الدرر المنثورفی تراجم اہل صادقفور (معروف بہ تذکرۂ صادقہ) میں ملے گا ۔

میری عمر کے اکاسی سال گزر چکے ہیں اور سال ہشتاد و دوم گزر رہا ہے ۔ یہ تخمینہ پر مبنی ہے ۔ اگر میں نے کبھی اس کے خلاف لکھا ہے تو وہ بھی تخمین پر مبنی تھا ۔ مجھے یقین ہے کہ صحیح وہ ہے جو اس جگہ میں نے لکھا ہے ۔

میری پرورش زنان خانے میں نہیں ہوئی ۔ میری قدیم ترین یادیں اپنے دادا سے وابستہ ہیں ۔ ان کے بعد والدین آتے ہیں ۔ ایک بات جو مجھے یاد ہے، اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے ۔ مگر یہ واضح رہے کہ وہ ایک بار کے سوا کبھی انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا ۔ متوسطات فارسی پڑھنے کے بعد میں نے عربی پڑھنا اور قرآن حفظ کرنا شروع کیا ۔ میرے قدیم ترین معلموں میں سے ایک سید سلیمان اشرف تھے جو بعد کو علی گڑھ کالج میں استاد دینیات ہوئے ۔ والد کی وفات کے بعد بریلوی صاحب کی طرف سے تحریک ہوئی کہ میں تعلیم کے لیے بریلی جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا ۔ پھلی بھیت کے ایک عالم وصی احمد جو محدث سورتی کہے جاتے تھے اور والد کے قائم کردہ مدرسے میں مدرس اوّل رہ چکے تھے ۔ اسی غرض سے مجھے لینے کے لئے پٹنہ آئے ۔ مگر میں پیلی بھیت جانے پر راضی نہ ہوا ۔ عربی صرف و نحو میں نے پٹنہ ہی میں مکمل کر لی ۔ نحو کی آخری کتاب جو میں نے پڑھی ۔ شرح کافیہ ہے جو جامی نے لکھی ہے ۔ منطق میں شرح تہذیب کے اتمام کے بعد میں نے قطبی پڑھنی شروع کی تھی ۔ مگر وہ نا تمام رہ گئی ۔ یہی حال شرح وقایہ اور مختصر المعانی کا ہوا ۔ قرآن میں نے پورا حفظ کر لیا ۔ یہ ٹھیک یاد نہیں کہ اس وقت میری کیا عمر تھی ۔ میری والدہ نے تعلیم کے معاملے میں مجھ پر بالکل جبر نہیں کیا اور مجھے اپنی راہ پر چھوڑ دیا ۔ میں نے گھر پر انگریزی شروع کی اور کچھ دنوں کے بعد شہر کے محمڈن اسکول کے درجہ پنجم میں داخل ہو گیا ۔ درجہ سوم میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ میں نے ایک صاحب کی ترغیب سے علیگڑھ جانے کا فیصلہ کیا ۔ وہاں تیسرے درجہ میں میرا داخلہ تو ہو گیا مگر مہینوں کے بعد لین کورٹ میں جگہ ملی ۔ اس درمیان میں کچھ دن سرسید کورٹ کے بعض طلبہ کے ساتھ رہا ۔ اور اس طرح مجھے کالج کی زندگی کے دیکھنے کا موقع ملا ۔ کچھ دن میں سید سلیمان اشرف کے ساتھ رہا ۔ بالآخر مجھے مورنسن کورٹ میں جگہ مل گئی اور وہاں سے علیگڑھ تک پاس کر گیا ۔ میں نے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا تھا کہ یہ فیصلہ ہو گیا کہ میں تعلیم کے لیئے انگلستان جاؤں گا اور میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہو گیا ۔ یہ درسگاہ میجر سید حسن بلگرامی نے علیگڑھ میں ان طلبہ کے لئے قائم کی تھی جو تعلیم کیلئے یورپ جانا چاہتے تھے ۔

یہاں انگریزی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں اور ریاضی تاریخ وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے لاطینی پڑھی صرف نحو کی ایک کتاب، ایک رسالہ GRADELIN اور ورجل کی انیڈ کا ایک ٹکڑا سبقاً سبقاً پڑھا۔ میں بلگرامی کالج میں ڈیڑھ سال رہا ہوں گا کہ میجر بلگرامی کا یکایک انتقال ہو گیا۔ اور ان کا کالج بند ہو گیا ــ یورپی جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس وقت یورپ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پٹنہ آکر ۱۹۱۶ء میں نجی کے طور پر میٹرکولیشن کا امتحان دیا اور کامیابی کے بعد پٹنہ کالج میں داخل ہوا۔ میں نے میٹرکولیشن کی طرح آئی۔اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کیا اور بی۔اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ آئی۔اے میں میرے مضامین انگریزی، اردو فارسی، منطق اور تاریخ تھے۔ بی۔اے میں بھی یہی مضامین رہے۔ باستثنائے منطق۔ اس کے بعد میں تحریک ترک موالات میں شریک ہو گیا اور تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا۔

مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان گیا اور بیرسٹری کے مڈل ٹیمپل میں داخل ہوا۔ اس وقت کیمبرج میں داخلے کا سوال ہی نہ تھا گرمیں رہا میں اور چند دوستوں کے ساتھ لمبی تعطیل میں جرمنی گیا۔ وہاں کئی مہینے رہا اور میں نے جرمن سیکھی۔ اکتوبر میں کیمبرج آیا اور وہاں میرا داخلہ فٹز ولیم ہاؤس میں ہو گیا۔ میں نے اکنومکس ٹرائی پوس لیا تھا۔ تعطیلات میں میں فرانس جایا کرتا تھا اور وہاں میں نے فرانسیسی سیکھی۔ کیمبرج میں ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ لینے نہ پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ چند ماہ کیمبرج کے قریب ہی ایک سینی ٹوریم میں رہا۔ بعد ازاں جاڑوں کے اوائل میں مئی مہینے میں مونٹانا (سوئٹزرلینڈ) گیا اور وہاں رہا۔ واپسی کے بعد میں امتحان میں شریک ہوا اور مجھے سکنڈ ڈویژن ملا۔ حصہ ۲ میں میں نے علم السیاست بھی لیا تھا اور بطور خود کچھ فلسفے اور نفسیات کی کتابیں بھی پڑھیں۔

اس کے بعد میرا قیام زیادہ تر لندن میں رہا اور میں نے بیرسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں میں پٹنہ آیا۔ میری صحت مضبوط نہ رہی۔ میں پریکٹس نہ کر سکا اور مجھے بار بار سینی ٹوریم جانا پڑا۔ بھوالی میں میں نے ہندی رسم الخط سیکھا۔ بعد کو جب غالب سے متعلق تحقیقات مدنظر ہوئی تو میں نے فارسی ادب کا مطالعہ کیا، اور کسی قدر پہلوی بھی سیکھی۔

اب میرا حال یہ ہے کہ قرآن بہت تھوڑا سا یاد ہے۔ عربی بہت کچھ بھول گیا۔ لاطینی اب اتنی کم جانتا ہوں کہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ کچھ الفاظ اور چند جملے جو یاد ہیں ان کا بہت بڑا حصہ انگریزی اور فرانسیسی کتابوں میں دیکھا تھا۔ جرمن بہت کچھ بھول گیا مگر لاطینی کی طرح نہیں۔ ہندی اب میں بالکل نہیں پڑھ سکتا۔ پہلوی رسم الخط بھی بھول گیا۔ معاشیات اب میں اس قدر کم جانتا ہوں کہ پیچیدہ بحث ہو تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ تو مجھے فلسفہ و نفسیات سے واقفیت ہے۔

میرے والد کے زمانے میں ہفتہ وار آگرہ اخبار آیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کوئی اور اخبار اردو یا انگریزی آتا تھا یا نہیں۔ انہیں جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سیاست سے دلچسپی نہ تھی اور میں نے اپنے یہاں کبھی سیاسی گفتگو نہیں سنی۔ ان کی وفات کے چند سال بعد میاں نے حسرت موہانی کے ماہنامے اردوئے معلی کی کئی پرانی جلدیں منگوائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ اس کے ادبی مضامین پڑھے جائیں لیکن ان کے ساتھ ان میں جو سیاسی مضامین تھے وہ بھی نظر سے گزرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پکا کانگریسی بن گیا اور ان مسلمانوں کو جو کانگریس کی مخالفت کرتے تھے برا سمجھنے لگا۔ اس زمانے میں میں حسرت کے علاوہ مظہر الحق، محمد علی اور ابوالکلام آزاد کے مداحوں میں تھا۔ الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی

سے انتظار کیا کرتا تھا وہ اب تک یاد ہے۔ میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس دہلی میں جس کے صدر پنڈت مدن موہن مالوی تھے۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالی کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں نے اپنے خطبے میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے۔

این استر[1] گلندن بابا ازاں من　　　دیں گربہ مصاحب بابا ازاں تو
از صحن خانہ تا لب بام از آں من　　　در سقف خانہ تا بشریا ازاں تو

میرے گریجویٹ ہو جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ایک خاص اجلاس میں جو کلکتہ میں ہوا تھا اور جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے، ترک موالات سے متعلق تجویز منظور کی۔ اس کے بعد پراونشیل کانگریس کمیٹی کے عہدہ داروں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب درپیش تھا۔ اس وقت جو لوگ اس کمیٹی پر قابض تھے ترکِ موالات کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں اس کے صدر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سکریٹری چندر بنسی سہائے بیرسٹر تھے۔ چند مسلم نوجوان جو کانگریس میں نئے نئے شریک ہوئے تھے یہ چاہتے تھے کہ کمیٹی مخالفین ترکِ موالات کے قبضے میں نہ رہے اور آل انڈیا کانگریس میں بہار کی طرف سے وہ لوگ جائیں جو اس تحریک کے موافق ہیں۔ اس وقت کوئی شخص جو ایک خاص عمر سے کم کا نہ ہو دس روپے ادا کرکے پراونشیل کانگریس کمیٹی کا رکن ہو سکتا تھا۔ بہت سے مسلمان اس کے ممبر ہو گئے اور جب انتخاب ہوا تو ایک شخص بھی جو تحریک کا مخالف تھا نہ عہدہ دار رہا نہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد رانچی میں رہتے تھے وہ اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے رکن نہ تھے وہ پہلی بار ہم لوگوں کی وجہ سے اس کے رکن ہوئے۔ ان لوگوں کے روزانہ انگریزی اخبار بہاری نے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں بڑی برہمی کا اظہار کیا لیکن اس سے ہوتا کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ مخالفین تحریک کو جو پراونشیل کانگریس کمیٹی پر قابض تھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ ہم لوگ انہیں اس طرح نکال پھینکیں گے۔ ورنہ ان کا مقابلہ ہم لوگوں کے لئے اتنا آسان نہ ہوتا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور گرما گرم خبر تھی کہ سی آر داس تحریک کی مخالفت کی بڑی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں ناگپور گیا۔ وہاں یہ دیکھا کہ بہتیاں لوگوں کو بڑا اندیشہ ہے کہ تحریک کی مخالفت کی تجویز منظور نہ ہو جائے۔ لیکن نہ جانے گاندھی جی نے کیا جادو کیا کہ سی آر داس ان کے ہم عقیدہ ہو گئے اور کلکتہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی۔ اس پر اجلاس نے صاد کیا۔ مخالفین میں جناح بھی تھے۔ مگر بڑی اکثریت تجویز کے حق میں تھی۔ میں کانگریس سے علیحدہ اس لئے ہوا کہ بتدریج مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوؤں میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو یہ فراموش نہ کر سکی ہے کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں حکومت کی ہے۔ اور ان پر مظالم ہوئے ہیں۔ میں یورپ سے ہندوستان واپس آیا تو جو کچھ ہوتا گیا، اس سے یہ بات واضح تر ہوتی گئی۔ میں سیاسیات سے الگ رہا لیکن جب مسلم لیگ زور آور ہوئی تو کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شاکی ہوئے کہ صوبے کی مسلم لیگ پر وہ لوگ قابض ہیں جن کی

---

[1] اشعار غالباً ایرانی شاعر سیکی کے ہیں۔ شاعر نے دکھایا ہے کہ ایک بھائی متروکات پدری میں سے خود کیا لینا چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے کیا چھوڑتا ہے۔ خود جو لینا چاہتا ہے اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ گویا کچھ نہیں۔ دوسرے کے لئے جو چھوڑتا ہے اس کا معاملہ برعکس ہے۔

ذہنیت ان لوگوں کی تھی جو خان بہادر یا خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ کامیابی جزوی ہوئی حالانکہ مسلم لیگیوں کی اکثریت ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ وجہ یہ کہ مرکز والے نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر ان کی ہر خلافِ قاعدہ بات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ میں جلد ان لوگوں سے الگ ہو گیا۔ اس وقت سے اس وقت تک میں سیاسیات سے الگ ہوں۔ اس حد تک کہ آج تک میں نے کسی الکشن میں ووٹ نہیں دیا مگر ایک الکشن میں میں نے ایک کمیونسٹ کی کانگریس کے مقابلے میں مدد کی تھی۔ اس کی وجہ خاص یہ تھی کہ مجھے اس پر حیرت تھی کہ کانگریسی امیدوار ایک کانگریسی کس طرح ہو گیا۔

اکثریت کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ یہ بھول جائے کہ مسلمانوں نے اس پر ظلم کئے۔ نہیں بھول سکتی تو یہ یاد کرے کہ آریاؤں نے اس ملک کے اصلی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا سلوک ان کے ساتھ کیا تھا۔ اسے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے والے مسلمانوں کو فرقہ پرست نہیں کہنا چاہیئے۔ اور ان مسلمانوں کی سرپرستی نہیں کرنی چاہیئے جن کی خود غرضی کی وجہ سے مسلمان انھیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ رُڑکیلا اور رانچی کے فسادات کے بعد میں اور خلیل احمد صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے گئے تھے انہوں نے خود ہی فسادات کا ذکر چھیڑا اور ایک کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ایک یہودی نے ان مظالم کے متعلق لکھی تھی جو یہودیوں پر ہوئے انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نہ پڑھی ہو تو پڑھوں۔ اس کے بعد ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا جو بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔ "MUSALMANS SHOULD DEVELOPE TOUGHNESS" انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو مصائب کا جس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے تھا، نہیں کیا۔ اور بلند کردار ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ مجھے دونوں باتوں سے اتفاق ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان ذرا ذرا سی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ اپنے مطالبات میں جائز حدود سے متجاوز نہ کریں۔ لیکن اکثریت کے خوف سے اس کے ہر مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔ انہیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہیں گے تو فرقہ پرست کہے جائیں گے۔ فرقہ پرست دراصل اکثریت کے وہ لوگ ہیں جو اقلیتوں کے ان افراد پر جو اکثریت کی دلالی کرتے ہیں، ہرگز بھروسا نہیں کرنا چاہیئے اور قانون کے حدود کے اندر رہ کر، ہر ممکن صورت یہ ظاہر کرنے کی اختیار کرنی چاہیئے کہ ان دلالوں کو اقلیتوں کے خیالات کی ترجمانی کا کوئی حق نہیں۔

میں نے بحیثیت علم، سیاسیات اور معاشیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کمیونزم بھی آ گیا۔ مجھے لاسکی کے اس قول سے اتفاق ہے کہ کمیونزم ایک مذہب ہو گیا ہے اور میرے لیئے یہ ممکن ہے کہ میں اسے تسلیم کر لوں کہ معاشی مساوات ہونی چاہیئے لیکن یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ حصول مقصد کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جس سے کمیونزم کو پھیلانے میں مدد ملے۔ لینن کا قول ہے کہ معاہدے توڑے جانے ہی کے لیئے ہوتے ہیں۔ میں کبھی ایسی جماعت پر جس کا یہ عقیدہ ہو بھروسا نہیں کر سکتا۔ کمیونسٹوں نے ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو جو سزا دی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ اور فرد جس طرح غلامی کی سطح پر پہنچا دیا جاتا ہے اسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بے شک غریبی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے لیکن حکومت کو یہ نہ چاہیئے کہ قانون سازی میں صرف اسے مدِ نظر رکھے کہ زیادہ ووٹ کس طرح ملیں گے۔ بہت زمانہ ہوا کہ ایچ جی ولز نے افراد کے حقوق کا چارٹ بنایا تھا۔ میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں۔ سب سے بڑی بات کہ میں ورلڈ اسٹیٹ چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وجود میں نہ آیا تو دنیا کا خاتمہ ہو یا نہ ہو تمدن و تہذیب کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا۔

ابتداء میں میرا مذہب وہی تھا جو میرے والد کا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے سر سید احمد خاں کی "خطبات احمدیہ" اور شبلی کی "علم الکلام" پڑھی تو عجیب تذبذب میں پڑ گیا جس کا میری صحت پر بُرا اثر پڑا۔ مختلف اصحاب سے تبادلۂ خیالات، جدید یورپی ادب جدید نفسیات کے مطالعہ کے بعد بالآخر میں جن نتائج پر پہنچا ہوں وہ یہ ہیں۔

انسان کی ذہنی صلاحیت ایسی نہیں کہ الٹی میٹ ریلیٹیز کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکے۔ میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ عالم کس طرح وجود میں آیا تو مبہوت ہو جاتا ہوں۔ میں خود قاصر ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے جو کچھ کہیں اسے بے چوں وچرا باور کروں۔ کہا جاتا ہے کہ پیمبروں کے پاس معجزے ہوتے تھے جو لوگوں کو قائل کر دیتے تھے۔ ویسے معجزے جن کا کتابوں میں ذکر ہے، آج پیش ہوں تو میں بھی قائل ہو جاؤں۔ یہ بات مجھے بالکل قرینِ انصاف نظر نہیں آتی کہ مجھ سے اس کی توقع کی جائے کہ معجزوں کی جگہ ان کی رپورٹوں کو قبول کروں۔ مذاہب میرے نزدیک انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کا امکان کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگا، بہت کم ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت سے لوگوں کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بکثرت اصحاب جو شریعت کے احکامِ ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ احکامِ ظاہری کی پابندی کریں مگر یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ ہے۔ انھیں خدمتِ خلق کی اہمیت کا احساس ہونا چاہیئے اور اس میں مسلم وغیر مسلم کا امتیاز نہیں رکھنا چاہیئے۔ انھیں محرم کی فضولیات اور درگاہ پرستی سے احتراز کرنا چاہیئے اس میں کروڑوں روپے ضائع ہوتے ہیں جو دوسرے کاموں میں، جو مفیدِ خلق ہیں، صرف ہو سکتے ہیں۔

عنفوانِ شباب میں مَیں اور چند اصحاب (سید محمود شیر، زبیر صدیقی، فضل سلیمان وغیرہ) نے ایک انجمن بنام انجمن ترقی اردو قائم کی تھی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد میری تحریک پر یہ پراونشیل انجمن بن گئی۔ میں اس کا سکریٹری ہوا اور لیڈی انیس امام صدر۔ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے ایک تجویز یہ منظور کی کہ مدارس میں علوم کی تعلیم ہندوستانی زبان میں ہو۔ اس سے اردو بولنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ ہندوستانی کے نام سے ہندی رائج کی جائے گی۔ حامیانِ اردو نے ایک جلسہ کیا اور اس معاملے کو انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا۔ میں نے اس سلسلے میں انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق سے مراسلت کی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی انجمن ایک کمیٹی قائم کرے اور اس کا جلسہ پٹنہ میں ہو اور وہ اس پر غور کرے۔ اس سلسلے میں جو مراسلت ہوئی تھی اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر عبدالحق ہندوستانی کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ علمی زبان ہو سکے۔ میں نے صوبۂ بہار میں جو اردو ہندی کا جھگڑا ہو رہا تھا، اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے انہیں بھیجے تھے۔ جو کچھ مَیں نے، کچھ دوسرے نے اکٹھا کئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے نام سے ایک کتابچہ چھپوایا جس میں اپنی طرف سے وہ معلومات پیش کیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے وہ کتابچہ کمیٹی کے ارکان کو بھیجا۔ مَیں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس سلسلے میں ملاقات کی تھی اور یہ استدعا کی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں سے ملیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور ملتا لیکن گاندھی جی کے یہاں جا رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں ایسی زبان لکھ سکتا ہوں جو اردو والوں اور ہندی والوں دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ بعد کو انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ گاندھی جی کو یہاں کے معاملات کی اطلاع ہو گئی اور انہوں نے مجھے تار دیا ہے کہ میں کمیٹی کے ممبروں

سے ملوں۔ اس کے لئے ایک وقت مقرر ہو گیا۔ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی صدارت کے لئے ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کا نام پیش کیا اور مجھ سے کہا کہ اغراض جلسہ سے ارکان کمیٹی کو مطلع کروں۔ میری تقریر کے بعد پروفیسر مجیب نے جو ایک رکن تھے کہا کہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر عبدالحق کے کتابچے سے آپ کو یہ سب معلوم ہو چکا تھا۔ ان امور کی کچھ اہمیت ہی نہیں تو پٹنہ آنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی۔ جلسہ صبح کے وقت ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملنے کا وقت دوسرے دن مقرر تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کہا کہ ہم لوگوں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اور کچھ تجویزیں منظور کر لینی چاہئیں جو ان کے سامنے پیش کی جا سکیں۔ بغیر اسکے کہ کافی غور و فکر سے کام لیا جائے چند تجویزیں منظور ہو گئیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد آئے تو ان کے ساتھ بدلیو سہائے (جنہوں نے سنڈیکیٹ سے متعلق تجویز پیش کی تھی اور جو بعد کو ایڈوکیٹ جنرل ہوئے) اور ایک صاحب جو اس زمانے میں پراونشیل کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، ان کے ساتھ تھے۔ کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں میرے پاس تھیں۔ میں نے انہیں ڈاکٹر عبدالحق کے حوالے کیا کہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائیں۔ انہوں نے آہستہ سے یہ کہا کہ ان سے "دکیلانہ" گفتگو کرنی چاہئے۔ اس کے بعد ہی ایک مسودہ غلام السیدین نے جو کمیٹی کے ایک رکن تھے نکالا، ڈاکٹر عبدالحق کو دکھایا۔ انہوں نے مجھے دیکھنے کو دیا۔ اس کے بعد یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دیا گیا۔ انہوں نے سرسری طور پر اسے دیکھا اور اس کے بعد اس پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر عبدالحق کے دستخط ہو گئے یہی راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ ہے۔ اس کے بموجب ہندوستان کی زبان ہندوستانی قرار پائی جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندی میں اگر کوئی علمی اصطلاح آئی تو اس کے ساتھ ہی توسین میں اس کا اردو بدل ہوگا اور اردو کی تحریر میں ہندی بدل۔

میں نے کہا کہ اس معاہدے کا تعلق تو سارے ہندوستان سے ہے، بہار میں جو معاملہ درپیش ہے اس کا کیا ہوگا۔ بلدیو سہائے نے جواب دیا کہ اردو والوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے انجمن کی پراونشیل شاخ جو باتیں پیش کرے گی منظور کر لی جائیں گی۔ یہ معاہدہ انجمن ترقی اردو کی مقرر کردہ کمیٹی کے سامنے آنے سے قبل ہی وجود میں آ گیا اور کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائی بھی نہیں گئیں۔

غلام السیدین اور پروفیسر مجیب، ڈاکٹر محمود کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو اس زمانے میں صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ معاہدہ کا مسودہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر عبدالحق اور بعض دیگر اصحاب نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کی خبر اگر نہ تھی تو مجھے اور بعض دوسرے ارکان کمیٹی کو۔ اس کے بعد سنڈیکیٹ یا وزیر تعلیم نے ایک ہندوستانی کمیٹی بنائی جس کے صدر ڈاکٹر سچدا نند سنہا اور ڈاکٹر عبدالحق اس کے ایک رکن مقرر ہوئے۔ صوبہ کی انجمن ترقی اردو کا کوئی رکن اس میں نہیں لیا گیا۔ سنہا کمیٹی نے باتفاق ڈاکٹر عبدالحق جو فیصلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ جامع اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں جو ہندی الفاظ ہیں اور ناگری پرچارنی سبھا کی شبد ساگر میں جو عربی فارسی الفاظ ہیں ہندوستانی سمجھے جائیں۔ ایسے ایسے الفاظ ہندوستانی قرار دیئے جانے لگے جو اردو والوں نے خواب میں بھی نہ سنے تھے۔ بلدیو سہائے نے صوبے کی انجمن کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کا قریب قریب نکلا۔ یہ بھی بھیلی۔ اور ایک جلسے میں یہ منظور ہوا کہ اس معاملے پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔

اس جلسے میں ایسے حامیان اردو بھی تھے جو انجمن کے رکن نہ تھے۔ صوبے کی انجمن کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ان الفاظ کے متعلق جو فیصلۂ مذکور کی رو سے ہندوستانی قرار پاتے ہیں اپنی رپورٹ دے۔ میں نے دونوں کتابوں سے بہت سے ایسے الفاظ نکالے جو اردو والوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ تماشا یہ کہ سنہا کمیٹی کے متعدد منظور کردہ الفاظ پر مرکزی انجمن کے اخبار میں بھی اعتراض چھپے تھے۔ یہ رپورٹ چھپی اور اسی زمانے میں یا اس کے بعد الٰہ آباد کے ایک ماہنامے میں بھی شائع ہوئی۔ پٹنہ میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے اس موقع

سے خالی فائدہ اٹھانا چاہا ۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اطلاع دی کہ کانفرنس کی اصلی غرض آپ کے خلاف ملامت کی تجویز منظور کرانی ہے ۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اسے ناکامیاب بنانے کے لیۓ ان سے ہزاروں روپے وصول کیۓ ۔ قاضی محمد سعید مجلس استقبالیہ اور صوبے کی انجمن کے سکریٹری تھے ۔ ان لوگوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور مجلس استقبالیہ کے رکن بنانے شروع کیۓ ۔ مجلس استقبالیہ کا صدر چننے کے لیۓ ارکان مجلس کا جلسہ تھا ۔ میں اس میں شرکت کے لیۓ گیا ۔ مجھے دیکھتے ہی مسعود عالم ندوی نے کہا کہ آپ کو صدر ہونا چاہیۓ ۔ میں نے انکار کیا ۔ یہ بظاہر موافق تھے لیکن دراصل مخالف ۔

ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب پر مختار الدین احمد صاحب (فی الحال پروفیسر) نے تبصرہ لکھا تھا اور ان کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی ۔ اس سلسلے میں ان سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی تھیں اور ان کا لہجہ قابل اعتراض تھا ۔ میرے ان کے تعلقات تھے ۔ اور مسعود عالم ندوی وغیرہ خلاف ۔ واقعہ یہ سمجھے کہ میرا لکھا یا لکھوایا ہوا ہے ۔ یہ لوگ اس بنا پر مجھ سے عداوت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ صدارت کے لیۓ میرا نام پیش ہو اور مجھے شکست دی جائے ۔ انجمن کی طرف سے ایک شخص کا نام پیش ہوا ۔ ان لوگوں کی طرف سے ایک اور شخص کا نام پیش ہوا جو کسی حیثیت سے بھی ان کے برابر نہ تھے اور یہ صاحب کامیاب ہوئے ۔ اگر میرا نام پیش ہوتا تو شکست مجھے ہوتی ۔ یہ لوگ سمجھے کہ اب سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا ۔ لیکن کانفرنس انجمن کی منعقد کردہ تھی اور اس زمانے میں میں اس کا صدر تھا ۔ انجمن نے طلبہ کے لیۓ بہت رعایت کردی اور بہت سے طلبہ استقبالیہ کمیٹی کے رکن ہوئے ۔ سبجکٹس کمیٹی کے ارکان کے انتخاب کے لیۓ جو جلسہ ہوا اس میں مخالف جماعت کا ایک شخص بھی منتخب نہ ہوا ۔ لیکن صدر مجلس استقبالیہ کے خطبے میں بہت سی غلط باتیں تھیں اور ڈاکٹر عبدالحق کی مدح سرائی کی گئی تھی ۔ کانفرنس کے صدر لاہور کے مشہور اخبار نویس ظفر علی خاں تھے جو ڈاکٹر عبدالحق سے ملے ہوئے تھے ۔ سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی جس میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات کا اعتراف تھا اور مجھے اسے پیش کرنے کے لیۓ کہا ۔ میں نے قطعاً انکار کر دیا ۔ وہ تجویز جو منظور ہوئی اس میں ڈاکٹر عبدالحق کا نام نہ تھا ۔ مگر سنہا کمیٹی کے فیصلوں سے سخت ناپسندیدگی ظاہر کی گئی تھی ۔

اس کے کچھ دنوں بعد ناگپور میں مرکزی انجمن کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان ہوا ۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اس کی مفصل روداد ناگپور، مختلف اصحاب کو بھیجی گئی اور وہاں خود مرکزی انجمن کی منعقد کردہ کانفرنس نے سنہا کمیٹی کے فیصلوں کو ناپسند کیا ۔ سید ضمیر الدین احمد صوبے کی انجمن کے ایک رکن نے ڈاکٹر سنہا کو اس کی خبر دی تو وہ سخت حیران ہوئے کہ جو فیصلے خود ڈاکٹر عبدالحق کی اتفاق رائے سے ہوئے ہیں خود ان کی کانفرنس نے اسے ناپسند کس طرح کیا ۔ تقسیم ہند کے بعد جب قاضی عبدالغفار مرکزی انجمن کے سکریٹری ہوئے تو اپنی مصلحتوں کے اقتضا سے انہوں نے یہاں کے کچھ لوگوں کو ملا کر ایک اور صوبے کی انجمن قائم کرائی ۔ مگر پرانی انجمن بھی کئی سال تک باقی رہی ۔ اور اردو ہندی کے اظہار رائے کے لیۓ ایک بڑی کانفرنس بھی اس کی طرف سے منعقد کی گئی تھی ۔

میرے والد کو جس زمانے میں میں باشعور ہوا ، شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی ۔ مگر ان کے خالو سید شاہ محمد حسین ، (جو) ان کی جائیداد کے منتظم بھی تھے اکثر شعر پڑھا کرتے تھے ۔ اور یہی حال نشتر کا بھی تھا ۔ مجھے یاد نہیں کہ کس طرح حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ میں نے دیکھا اور اس کے کئی پرانے مجلدات منگوائے اور ان میں شعرائے اردو سے متعلق جو مضامین تھے پڑھے ، شعر العجم کی جلدیں بھی دیکھیں ۔ بعد کو

مجھے غالب سے دلچسپی ہوئی اور میں نے اتنی بار اس کا دیوان دیکھا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے یاد ہوگیا تھا۔ میں نے پہلا مضمون جو شعرائے اردو کے بارے میں لکھا، پٹنہ کے ایک ماہنامے میں، جو جلد ہی بند ہوگیا، شائع ہوا تھا۔ اس میں اور کچھ نہ تھا۔ گلزار ابراہیم مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل نے شعرائے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا گیا تھا۔ معارف میں گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات کے ماخذ کے متعلق خود اس کے بیان کا ترجمہ شائع ہوا۔ میں نے ایک خط میں جو بنام مدیر معارف تھا اس کے اغلاط کی نشاندہی کی جو میری اجازت سے مدیر نے چھاپ دیا۔ اس کا جواب معارف میں نکلا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد انگلستان چلا گیا اور جواب الجواب شائع نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں میری معلومات زیادہ نہ تھیں اور میرے بعض اعتراضات غلط تھے، رہا دتاسی تو اس کے متعلق بعد کو میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ یورپ میں میں نے بہت سے پرانے اور نئے شعراء کا کلام دیکھا۔ لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے یورپی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں جو شعرائے اردو کے تذکرے اور دواوین ہیں، ان میں سے بعض کے متعلق میں نے یادداشتیں لکھیں جن کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا ہے۔ یورپ جانے سے قبل میں نے چند شعر بھی کہے تھے۔ ان میں سے کچھ فارسی کا ترجمہ تھے۔ ایک شعر جو میں نے لڑکپن میں بیت بازی کی ضرورت کے لئے لکھا تھا یہ ہے ؎

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگِ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

پروفیسر مختار الدین احمد نے میرے متعلق نقوش میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں جو میرے اشعار منقول ہیں، ان میں سے کچھ ترجمہ ہیں، نہ جانے کیوں انہوں نے یہ بات نہیں لکھی۔ شعر اب بھی میں موزوں کر لیتا ہوں مگر میں شاعر نہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد پٹنہ میں مستشرقین کی کانفرنس ہوئی۔ اس کے لیے میں نے ایک بسیط مقالہ مصحفی پر لکھا تھا۔ اس وقت تک مصحفی کے تذکرے شائع نہیں ہوئے تھے اور اس کے دواوین بھی غیر مطبوعہ تھے۔ میں نے اپنے مقالے میں ان سب سے کام لیا تھا۔ مدیران اردو معارف نے اسے اشاعت کے لئے لینا چاہا تھا مگر میں اس پر کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بغیر اشاعت مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اضافہ ہوا نہیں اور مقالہ ضائع ہوگیا۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں صوبے کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک رسالہ "معیار" نکالا تھا۔ اس کے پانچ چھ شمارے نکلے۔ اس کے بعد یہ میری خرابیٔ صحت کی وجہ سے بند ہوگیا۔ میں نے مصحفی کے آٹھوں دیوانوں کا انتخاب ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا۔ اس میں چار یا پانچ ہزار اشعار تھے۔ پروفیسر سرور نے جب وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے تھے، اسے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن پھر ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ اب اس کے چند اوراق باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے جب جب پریکٹس شروع کرنی چاہی، بیمار ہوگیا، بالآخر میں نے اس کا خیال ہی دل سے اٹھا دیا۔ اور ادبی تحقیقات کو بطور مشغلہ اختیار کیا۔ میں نے اسے تنقید پر کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ میں نے اپنے کو اس کے لئے زیادہ موزوں سمجھا ہوگا۔ جب غالب سے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے فارسی زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ میں نے پٹنہ رامپور، علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد، بمبئی، لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات کا معتدبہ حصہ دیکھا ہے۔ میں نے

ان سے متعلق جو یادداشتیں لکھی تھیں وہ کچھ ہیں، کچھ ضائع ہو گئیں۔ جو ہیں وہ بھی اس طرح منتشر ہیں کہ ان سے کام لینا مشکل ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جس زمانے میں بہار کے گورنر تھے، ادارۂ تحقیقات اردو کا کتب خانہ قائم ہوا۔ اس کا افتتاح انھوں نے کیا تھا۔ اور جس جلسے میں یہ رسم انجام ہوئی تھی اس کی صدارت شری کرشن سنہا نے کی تھی جو اس زمانے میں بہار کے چیف منسٹر تھے۔ اس موقع پر ایک ادبی نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس میں جو مخطوطات پیش ہوئے تھے۔ ان کی فہرست جو قاضی محمد سعید نے تیار کی تھی چھپ چکی ہے۔

"غالب بحیثیت محقق" کم و بیش ۲۵۰ صفحات کا مقالہ ہے جو نقد غالب مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد میں شامل ہے۔ جہاں غالب کے عنوان سے میں نے دو ڈھائی سو صفحے لکھے ہوں گے۔ یہ غالب انسائیکلوپیڈیا اگر مکمل ہو جائے تو ہزار صفحوں سے کم کی نہ ہو گر اس کی تکمیل کی بالکل امید نہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ غالب نے فارسی اردو میں برہان قاطع کے متعلق جو رسالے لکھے تھے، میں نے یکجا کر کے "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" کے نام سے شائع کر دیئے ہیں۔ ارادہ تھا کہ ایک دوسری جلد میں اس کتاب کے مباحث سے مفصل بحث کی جائے۔ مگر اب تک یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا۔

غالب کے علاوہ جن شعرا سے مجھے خاص طور پر دلچسپی رہی ہے، سودا۔ میر۔ مصحفی اور انشا ہیں۔ ذکر میر و نکات الشعراء مولفۂ میر پر جو تبصرہ میں نے لکھا ہے چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب متعلق میر کی مفصل تنقید عیارستان میں ہے۔ سودا، مصحفی اور انشا کے متعلق بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اور ان کے متعلق اتنا مواد میرے پاس یا میرے علم میں ہے کہ کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تعین زمانہ کے تحت میں نے سو ڈیڑھ سو صفحے لکھے ہوں گے اور کئی سو صفحے اور لکھ سکتا ہوں۔ یہی حال لسانیات سے متعلق مباحث کا ہے۔ میرا ایک طویل مقالہ "آزاد بحیثیت محقق" ہے اور میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب متعلق زبان و ادب بہار پر ایک طویل تبصرہ لکھا تھا۔ فارسی مخطوطات کے بارے میں میرے بہت سے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی کی خدمت کے اعتراف کے طور پر صدر ہندوستان نے مجھے سرٹیفکیٹ آف آنر دیا تھا۔ میری ایڈٹ کی ہوئی کتابیں دیوان جوشش، دیوان رضا اور قطعاتِ دلدار ہیں۔ مصحفی کا دیوان ہشتم ایڈٹ کر رہا ہوں یہ کتب خانۂ خدا بخش کی طرف سے شائع ہوگا۔

میرے والد کو داستان امیر حمزہ کے مطالعے کا شوق تھا اور ان کے پاس اس کی بہت سی جلدیں تھیں۔ میں نے یہ سب بڑی دلچسپی سے پڑھیں۔ بوستان خیال کی ایک جلد کہیں اور ملی۔ مگر اس میں میرا دل نہ لگا۔ بعد کو میں نے شرر و سرشار کے ناول اور رینالڈس کے ناول کے تراجم دیکھے۔ پریم چند کی بہت سی کہانیاں بھی پڑھیں۔ بعنوان شباب میں میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام (جذبات حسرت کا مصور) سے چھپی تھی۔ میں بنگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوا، تو میں نے بہت سے انگریزی ناول دیکھے اور یہ سلسلہ پٹنہ واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یورپ میں شاعری کی بہ نسبت مجھے ناول دیکھنے کا زیادہ شوق رہا اور انگلستان فرانس، اٹلی، اسپین، فورمے، روس، جرمنی اور امریکہ کا شاید ہی کوئی بڑا ناول لکھنے والا ہو جس کے ناول میری نظر سے نہ گزرے ہوں۔ میرے زمانۂ اقامت یورپ میں جیمس جوائس اور مارسل پروست کا بہت چرچا تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد بھی میری دلچسپی باقی رہی اور میں نے "معیار" کے لئے خود بھی ایک کہانی لکھی جو ایک فرضی نام سے اس میں شائع ہوئی۔ کہانی کا عنوان "ایک مہ پارہ نوجوان" ہے۔

میں نے دو تین کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔

بلگرامی میموریل کالج میں میں سینئر کیمبرج کی تیاری کر رہا تھا۔ اور مرچنٹ آف وینس نصاب میں تھا۔ میجر بلگرامی نے اسے اسٹیج کرایا اور مجھے بھی ایک پارٹ دیا۔ اس زمانے میں مجھے یہ ڈراما قریب قریب سب یاد تھا۔ بی اے کے لئے میں نے "ایز یو لائک اٹ" پڑھا۔ مجھے ڈراموں سے واقعی دلچسپی اس وقت ہوئی جب میں نے انگلستان میں تھیٹر میں ڈرامے دیکھے۔ میرے زمانۂ اقامت انگلستان میں کوئی اہم ڈراما وہاں اسٹیج ہوا ہو، ایسا نہ تھا جو میں نے نہ دیکھا ہو، یونانیوں کے ڈراموں سے لیکر پرانڈیلو (اطالوی تمثیل نگار جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا) تک کوئی بڑا تمثیل نگار نہیں جس کے ڈرامے میں نے نہ دیکھے ہوں۔ تنقیدی ادب کی بھی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔

میں نے دوران قیام یورپ میں فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے کچھ حصے دیکھے ہیں۔ ان ممالک میں سب سے زیادہ میں فرانس سے واقف ہوں۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے یہاں کے بہت سے شہر دیکھے جہاں عموماً میں ریسرچ کے سلسلے میں گیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، حیدرآباد سندھ، لاہور اور ڈھاکہ گیا ہوں۔

قاضی عبدالوحید نے تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ میں سب سے بڑا اور میرے بعد میری بہن عائشہ۔ ان کی شادی خان بہادر سید محبوب عالم سے ہوئی جو قاضی اسد علی کے بیٹے کے نواسے تھے۔ ان کے یہاں ۱۹۲۲ء میں ایک بیٹی انجمن آرا عرف احمد پیدا ہوئی اس کے بعد وہ چند روز بیمار رہ کر قضا کر گئیں۔ میری والدہ کو ان سے جتنی محبت تھی کسی اور اولاد سے نہ تھی۔ ان کی موت کے بعد ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ۱۹۲۴ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

تقسیم ہند کے بعد سید محبوب عالم کراچی چلے گئے۔ ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔ ان کی بیٹی اور ان کی اولاد وہاں ہے۔ قاضی محمد سعید ان کے بعد تھے۔ انہوں نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں سرکاری مدرسے میں پڑھنا چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے بی اے کی ڈگری لی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد وہ برلن گئے اور برلن یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان کا موضوع نطشے کا فلسفۂ تعلیم تھا۔ وہاں وہ بہت دن رہے مگر اپنا کام مکمل نہ کر سکے۔ جنگ سے کچھ قبل وہ ہندوستان آئے۔ ممکن تھا کہ پھر وہاں جاتے لیکن جنگ چھڑ گئی۔ یہاں وہ ہم لوگوں کی مشترک جائداد کا انتظام کرتے رہے۔ صوبے کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے اور ادارۂ تحقیقات اردو کے قائم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اس صوبے میں جو فسادات ہوئے اور ایک ریلیف کمیٹی قائم ہوئی اس کے وہ سکریٹری تھے اور انہوں نے اپنا کام بڑی جانفشانی سے کیا۔ وہ اس کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوب معلوم ہے کہ ہزاروں روپے اپنے بھی ریلیف میں خرچ کئے۔ بعد کو یہاں مشورت کمیٹی کی جو شاخ قائم ہوئی تھی اس سے ان کا گہرا تعلق تھا اور الکشن کے متعلق جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کے وہ سکریٹری تھے۔ وہ مجرد رہے۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے کو قومی خدمت کے لئے وقف

کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد قاضی محمد فرید تھے۔ کیمبرج میں معاشیات اور تاریخ کی ڈگریاں لینے کے بعد؟ ہندوستان واپس ہوئے تو انہیں بہار میں کوئی نوکری نہ ملی۔ امرتسر کے اسلامیہ کالج میں مل گئی اور انہوں نے لاہور میں شادی کرلی۔ بعد کو وہ پشاور میں نوکر ہوئے اور بالآخر کراچی یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ ان کی وفات سنہ ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ ان کی بیوی اور ان کی اولاد پاکستان میں ہے۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی کہ میری والدہ نے میرا عقد نکاح شاہ نظام الدین کی بیٹی سے جو خان بہادر سید منیر الدین احمد (صدر گلی شہر پٹنہ) کی نواسی تھیں کر دیا۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک آدھ برس بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کئی برس بعد میری شادی شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ وکیلوں میں سے تھے۔ اور کچھ دن سرکاری پلیڈر بھی رہے تھے۔ یہ دراصل غازیپور کے رہنے والے تھے۔ شادی یہاں ہوئی تو یہیں بس گئے۔ ان کی وفات سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ میری اولاد صرف ایک ہے۔ قاضی محمد مسعود جو سوشیولوجی میں ایم۔ اے ہیں اور قانون کا امتحان پاس کرچکے ہیں۔

منطق نے بتایا کہ تناقض و تضاد کیا ہے۔ اور صحت فکر کے لئے مغالطوں سے بچنا کس قدر ضروری ہے۔ نفسیات نے سکھایا کہ اعمال کے محرکات لازماً وہ نہیں ہوتے جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔ شخصیت کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے اور کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرنا کس قدر مشکل ہے۔ قانون شہادت کی تعلیم یہ ہے کہ واقعات اور آرا میں تمیز کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ گواہ جو کچھ کہتا ہے وہ کس حد تک ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور کس حد تک سماعت پر۔ گواہوں کے بیانات پر کسی اچھے وکیل کی جرح جس شخص نے دیکھی ہے اسے اس کا احساس ہوا ہوگا کہ جو باتیں پہلے بڑے اعتماد سے کہی گئی تھیں وہ کتنی ناقابل قبول تھیں۔ گواہ صادق القول ہو۔ جب بھی اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کا مشاہدہ صحیح نہ ہو اور اس کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہو۔ ان لوگوں کو جو تحقیقات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اسٹینلی گارڈنر کے وہ ناول دیکھیں جس میں پیری میسن گواہوں پر جرح کرتا ہے۔ جدید یورپی اور امریکی (کمیونسٹوں کا ادب اس میں شامل نہیں) ادب کی روح کا اظہار (ایک یورپی نقاد کے قول کے مطابق) ایک بڑی علامت استفہام سے ہوتا ہے۔ کوئی بات محض اس لئے قبول نہیں کی جاتی کہ مدت دراز سے لوگ اسے مانتے آئے ہیں۔ ہر مسئلے پر از سر نو غور کیا جاتا ہے۔

عنفوان شباب سے قطع نظر مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس کی " اِقْتَدَیْتُ بِھٰذَا الْاِمَام " کہہ کر پیروی کرنے لگوں اور وہ لوگ جو ابتداء میں مجھے بہت بڑے نظر آتے تھے ان میں سے بہت سے پست نظر آنے لگے۔ میں نہ جانے کتنی کتابوں سے متاثر ہوا۔ اور جن لوگوں سے زیادہ تعلقات رہے، میں نے ان کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ادب کو سیاسی و معاشی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کا کوئی عقیدہ نہ ہو۔ ادیب کا اپنے عہد کے مسائل سے اس قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیئے جو ایک پارٹی کے ممبر کا ہوتا ہے۔

شاعری ہو یا تمثیل یا کہانی، اس میں جدت ہو تو ٹھیک ہے مگر جدت محض برائے جدت نہیں۔ میں ایسے ادب کا جو لکھنے والے کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آسکے قائل نہیں۔ نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے کا مافی الضمیر، وہ غلط ہو یا صحیح بالکل واضح طور پر ظاہر ہو جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ ورلڈ اسٹیٹ وجود میں آئے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ معاشرت بھی ایک طرح کی ہو۔ میں مغربی لباس پہنتا ہوں۔ مغربی کھانے کو بحیثیت مجموعی مشرقی کھانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ صحیح نہیں (جیسا کہ پروفیسر مختار الدین احمد نے لکھا ہے) کہ میری محبوب غذا مرغ پلاؤ ہے۔ مشرقی کھانوں میں مَیں کباب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے جانوروں کا گوشت کھانا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار مہینوں تک گوشت نہ کھایا۔ مگر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ آم میرا محبوب پھل ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ میرے نزدیک سب سے اچھا آم سپیا ہے (بہ قول پروفیسر مختار الدین احمد) کم از کم کسی آم میں جنہیں میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سردہ، ناشپاتی، اسٹرابری، چری، سنگترا، اناس بھی مجھے بہت مرغوب ہیں۔ سگریٹ پینا میں نے انگلستان جا کر شروع کیا۔ میں ترکی سگریٹ کو امریکی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سگار کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ چار پانچ برس سے میں نے سگریٹ پینا بالکل بند کر دیا ہے اور اس سے مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب میں نے کیمبرج میں پینی شروع کی۔ وہاں میرے بہت کم دوست تھے جو نہ پیتے ہوں۔ میں دو تین بار حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا۔ اور اس کا برا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں نے کبھی زیادہ نہیں پی۔ میں برگنڈی کو اور شرابوں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتا تھا۔ دو تین برس سے میں نے شراب پینا بالکل بند کر دیا ہے اس سے بھی مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔

میں نے کرکٹ، ٹینس وغیرہ کھیلے۔ لیکن اس قسم کے کسی کھیل میں آگے نہ بڑھ سکا اور میں نے انہیں کھیلنا ترک کر دیا۔ شطرنج کا مجھے بہت شوق تھا لیکن میں اچھا شاطر نہ بن سکا اور مدتوں سے میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ برج میں نے انگلستان جاتے ہوئے جہاز پر سیکھا اور اس کے بعد یہ میرا محبوب کھیل ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رات رات بھر برج کھیلا ہے۔ اس کا شوق ہندوستان واپسی کے بعد بھی رہا مگر اب اس سے کچھ تعلق نہیں۔ گزشتہ ۲۵ سال میں مَیں نے صرف ایک بار برج کھیلا۔

میں نے اشخاص اور معاملات کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیابی ہوئی بھی ہو تو جزوی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر جیسا کہ بوڈلیر نے کہا ہے، اس کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ نہ جانے کس حد تک میں کامیاب ہو سکا ہوں۔
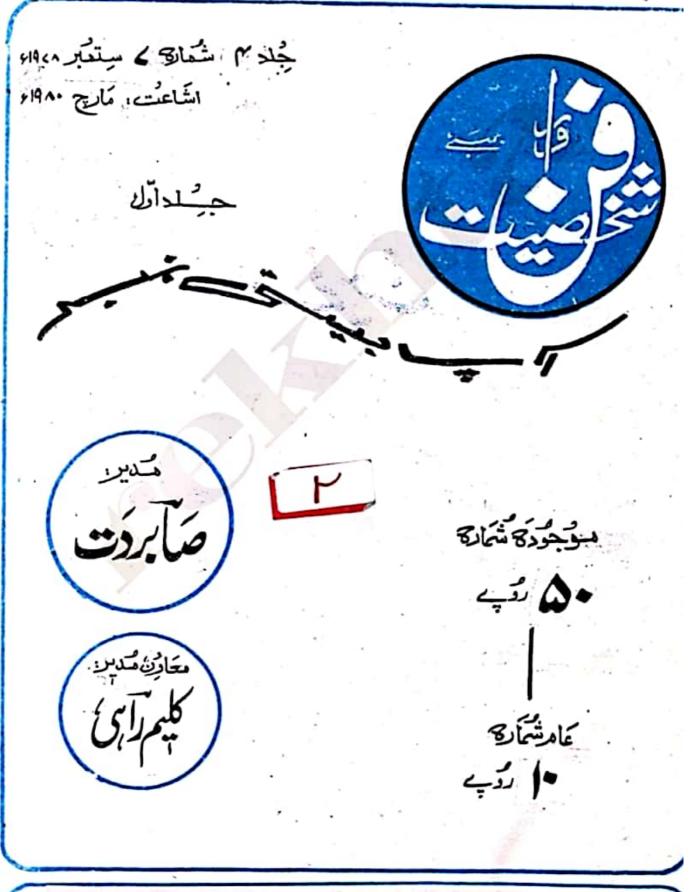
SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دت